مکاتیب

(۱)

محترم قارئین الشریعہ اور اکابر تبلیغ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مفتی محمد عیسیٰ خان صاحب گورمانی کی کتاب ''کلمۃ الہادی الی سواء السبیل'' پر تقریظ کے نام سے میرا ایک خط چھپا ہے۔ میں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تقریظ نہیں، بلکہ میرا ذاتی خط ہے جو میں نے مفتی محمد عیسیٰ صاحب کو اس کتاب پر تبصرہ کی خواہش پر تحریر کیا اور محض از راہ تفنن طبع کچھ جملے مزاح کے شامل کیے گئے۔ خط کے آخر میں مولانا کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ نہ اس خط کو شائع فرمائیں اور نہ ہی کتاب شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے ہمارا اپنا نقصان ہے۔ صرف ایک شخصیت کی تقریروں کی وجہ سے پوری جماعت کو لپیٹ میں لے لینا ہمارے اکابر کی روایت نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ مفتی صاحب مدظلہ العالی نے میرا ذاتی خط عوام کے لیے شائع فرما کر غلطی کی ہے۔ میں تبلیغی جماعت کے اکابر کا دل وجان سے احترام کرتا ہوں۔ جماعت کا کام قابل تعریف ہے اور علمائے کرام شاید وہ کام نہیں کر سکے جو تبلیغی جماعت نے گزشتہ ستر سال میں کیا ہے۔ کوتاہیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ تبلیغی جماعت کے اصحاب خطا سے پاک نہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو معصوم نہیں سمجھتے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ افراد کی کمزوریوں کو پوری جماعت کے نظام کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ ''کلمۃ الہادی'' کے چھپنے سے کوئی دینی خدمت نہیں ہوئی، بلکہ اس سے مخالفین جماعت کو فائدہ پہنچا ہے۔

قاضی محمد رویس خان ایوبی
رئیس مجلس افتاء، آزاد جموں وکشمیر

(۲)

گرامی قدر جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ مزاج شریف!

ماہنامہ الشریعہ کا باقاعدہ قاری ہوں۔ آپ نے آزادانہ علمی بحث کے ذریعے مسائل کو سمجھنے کا بہترین طریقہ اختیار کیا ہے جو قابل قدر ہے۔ بعض حضرات کی بے جا تنقید سے دل برداشتہ نہ ہوں اور یہ سلسلہ جاری رکھیں۔

تازہ شمارہ [مئی/جون ۲۰۰۹] میں مولانا مفتی محمد طیب صاحب صدر جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد کی گفتگو شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے "اختلاف امتی رحمۃ" کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے جبکہ یہ درست نہیں ہے، کیوں کہ تمام محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کوئی حدیث نہیں ہے۔ حتیٰ کہ صحیح، ضعیف اور موضوع سند کے ساتھ بھی اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ "ونقل المناوی عن السبکی انہ قال: ولیس بمعروف عندنا ولم اقف لہ علی سند صحیح ولا ضعیف ولا موضوع، واقرہ الشیخ زکریا الانصاری فی تعلیقہ علی" تفسیر البیضاوی"۔

امید ہے کہ اس کی تصحیح فرما دیں گے تاکہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ حق کو جاننے اور عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔ احباب کو سلام۔

(مولانا) محمد یاسین ظفر
پرنسپل جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

(۳)

مکرمی پروفیسر محمد اکرم ورک صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج شریف بخیر ہوں گے۔ مارچ ۲۰۰۹ء کے 'الشریعہ' میں چھپنے والے آپ کے مضمون ''حضرت مجدد الف ثانیؒ کا منہج واسلوب'' کی بعض عبارات کی وجہ سے ذہن میں کچھ الجھاؤ کی سی کیفیت پیدا ہونے کی وجہ سے آپ سے مختصر سی بات ہوئی اور بعد میں مدیر الشریعہ جناب عمار خان ناصر صاحب سے بھی بات ہوئی۔ مدیر صاحب کے حکم پر کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ ٹھنڈے دل سے مطالعہ فرما کر نہایت ہی شفقت کے ساتھ جواب سے نوازیں گے۔

آپ نے لکھا ہے: ''ہندوستان میں شیخ مجددؒ کے سامنے کئی محاذ فوری توجہ کے متقاضی تھے۔ ایک تو یہ کہ نام نہاد صوفیا کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا قلع قمع کر کے اسلام کو اس کی اصل اور حقیقی شکل وصورت میں پیش کیا جائے۔'' (الشریعہ، مارچ ۲۰۰۹ء ص ۱۳)

ہندوستان کی داخلی صورت حال کے تحت آپ نے لکھا ہے: ''داخلی فتنوں میں نام نہاد صوفیا کی تعلیمات اسلامیان ہند کے لیے گمراہی کا سبب بن رہی تھیں۔ کچھ نام نہاد اہل تصوف ہندو فلسفہ کو اسلام کے پیراہن میں پیش کر رہے تھے۔'' (ایضاً ص ۱۱)

اسی صفحہ پر آپ نے اٹک کے ملا محمد کے وضع کردہ عقیدہ ذکری اور بایزید المعروف ''پیر روشن'' مدعی نبوت کے وضع کردہ ''فرقہ روشنائیہ'' اور سید محمد جونپوری کی تحریک ''مہدویت'' کو اور احمد نگر کے والی سلطنت برہان نظام شاہ کے شیخ طاہر بن رضی اسماعیلی قزوینی کے زیر اثر آ کر شیعہ مذہب قبول کر لینے اور خلفائے ثلاثہ پر علی الاعلان تبرا کرنے اور

کروانے اور کشمیر میں میر شمس الدین عراقی کے شیعیت کو فروغ دینے اور شہنشاہ ہمایوں کے دل میں شیعوں کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جانے کو ''نام نہاد صوفیاء'' کی پھیلائی ہوئی گمراہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مذکورہ بالا جملہ نتائج کے حصول کے لیے کوشش کرنے والے ''نام نہاد صوفیاء'' کے ہجوم میں سے بہت زیادہ مشہور صرف پانچ صوفیوں کے نام کیا ہیں؟ ہر نام کے ساتھ اس کے سلسلہ طریقت کا نام اور درگاہ کا نام جس سے وہ ''نام نہاد صوفی'' منسوب ومشہور ہو، ضرور بتائیں تاکہ ہم جان سکیں کہ سلسلہ نقشبندیہ، سلسلہ قادریہ، سلسلہ سہروردیہ، سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ اویسیہ کے کس کس نام نہاد صوفی اور سجادہ نشین نے کس کس درگاہ وآستانہ سے مذکورہ بالا نتائج باطلہ کے حصول کے لیے اتنا زیادہ کام کیا کہ پورا ہندوستان ہی گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں اور تاریکیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا؟ ہم تو مذکورہ بالا جملہ عیوب اور اہل تصوف میں خلیج کا لامتناہی سلسلہ تصور کرتے ہیں۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ ہماری غلط فہمی کا ازالہ فرما کر احسان عظیم سے نوازیں اور ہمیں بتادیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات شریف میں یا اپنی کس کتاب کے کس صفحے پر مذکورہ بالا جملہ عیوب ونتائج باطلہ کو نام نہاد صوفیا سے منسوب کیا ہے؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اولیائے امتؒ کا وجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ رہنے والے معجزات ہیں کہ انہی کی برکت سے لوگوں کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں، انہی کی بدولت شہروں سے بلائیں دفع کی جاتی ہیں، انہی کی دعاؤں سے حق تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے اور انہی کے وجود کی برکات سے عذاب دفع کیے جاتے ہیں۔'' (جمال الاولیاء، ص ۲۳)

کس قدر دکھ کی بات ہے کہ گمراہی پھیلانے والے ''نام نہاد صوفیاء'' کی نشاندہی کرتے ہوئے آپ نے چشتی نظامی سلسلہ کے مشہور شیخ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تذکرہ کیا ہے اور ثبوت کے طور پر حضرتؒ کے ان خطوط کا تذکرہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب تاریخ مشائخ چشت، ص ۴۱۸ کے حوالے سے کیا ہے جو انہوں نے اپنے خلیفہ خاص حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کی طرف تحریر فرمائے تھے کہ مجددی خاندان کے صاحبزادوں کی موجودگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سماع وقوالی کی مجالس کے انعقاد میں احتیاط برتی جائے تاکہ مجددی شہزادوں کو گراں نہ گزرے۔ (الشریعہ، مارچ ص ۱۳) احقر نہایت ہی ادب سے عرض کرتا ہے کہ کیا آپ شیخ شاہ کلیم اللہؒ کی گمراہ کن سرگرمیوں میں کچھ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟ اگر نہیں تو پھر ایسی تلخ مثال دینے کے لیے صرف اسی بزرگ ہستی کا انتخاب کیوں فرمایا؟

شاہ جیؒ کا اپنے خلیفہ کو احتیاط کا حکم صادر فرمانا تواضع کے طور پر تھا کہ یہی صوفیاء کرام کی شان ہے کہ دوسرے سلسلہ کے صوفی کے سامنے طریقت کے اختلافی امور سے اجتناب فرماتے تھے۔ صوفیاء کرام میں مولویانہ تشدد نہیں ہوتا کہ جہاں دیکھا مناظروں کے دنگل جما لیے۔ مکتوبات شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دوسرے سلاسل کے اختلافی اعمال کی بھی اچھائیاں بیان فرماتے ہوئے سلسلہ نقشبندیہ میں شمولیت کی ترغیب فرمائی ہے۔ اس ضمن میں مکتوبات شریف حصہ چہارم دفتر اول کے مکتوب نمبر ۲۶۰ کا بغور مطالعہ فرمائیں جو آپؒ نے حضرت میاں شیخ محمد صادقؒ کی طرف تحریر فرمایا تھا۔ آپؒ فرماتے ہیں:

''اے فرزند! جان لے کہ جب طریقہ نقشبندیہ میں سیر کی ابتدا قلب سے ہے جو عالم امر سے ہے تو بات کی ابتدا

بھی عالم امر سے کی گئی۔ برخلاف مشائخ کرام کے باقی طریقوں کے جو شروع میں تزکیہ نفس کرتے ہیں اور قالب یعنی وجود کو پاک فرماتے ہیں اور بعد ازاں عالم امر میں آتے ہیں اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہو، اس میں عروج کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی نہایت ان بزرگوں کی بدایت میں مندرج ہے اور یہ طریق سب طریقوں سے اقرب ہے۔''

دیکھیے کس قدر کمال، خوبصورتی اور حکمت کے ساتھ حضرت شیخ مجددؒ نے دوسرے سلاسل میں بھی نورانیت کو تسلیم کرتے ہوئے سلسلہ نقشبندیہ کو اقرب قرار دیا ہے۔ اسی کو صوفیا تواضع کہتے ہیں جس کا عملی ثبوت چشتی نظامی سلسلہ کے مذکورہ بالا بزرگؒ نے دیا تھا، لیکن افسوس کہ آپ نے کہاں کی بات کو کہاں لا کر چسپاں کر دیا۔

حضرت شیخ مجدد نے مکتوبات شریف میں کچھ مقامات پر علما سے بے شک اختلاف کیا ہے، لیکن کسی ایک جگہ بھی کسی نام نہاد صوفی کو تنقیص وتنقید کا نشانہ نہیں بنایا، کیوں کہ طریقت کے چاروں سلاسل کی خلافت سے فیض یاب صوفیاء عوام کے قلوب پر حکمرانی کرتے ہیں۔ آپ نے پورے مضمون میں کسی ایک مقام پر بھی صوفیاء کرامؒ کی خدمات اسلام کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ نام نہاد صوفیا کہہ کر تصوف کی تردید ہی کی ہے۔

آپ کو بخوبی معلوم ہوگا کہ نقشبندیوں اور چشتیوں کے مابین سماع اور اس کی جزئیات مثلاً مزامیر اور رقص اور ذکر بالجہر وغیرہ پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجددی صاحبزادوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے چشتی صوفی بزرگ شیخ کلیم اللہؒ جہاں آبادی نے اپنے خلیفہ صاحب کو نقشبندیوں اور چشتیوں کے درمیان اختلاف کو ہوا دینے والے امور کے متعلق احتیاط برتنے کا حکم صادر فرمایا تھا، نہ کہ ان امور سے منع کیا یا انہیں غلط قرار دیا۔ مزامیر کے ساتھ سماع چشتیوں میں ہنوز جاری ہے، لیکن صوفیاء کرام اب بھی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ ''شیخ مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں بدعت حسنہ کے تصور کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور اس طرز فکر کو دین کی بنیادیں منہدم کرنے کے مساوی قرار دیا۔'' (الشریعہ ص ۱۳)

شیخ مجددؒ نے مکتوبات شریف میں بدعات حسنہ کو دین کی بنیادیں منہدم کرنے کے مساوی کس جگہ قرار دیا ہے؟ لغوی اعتبار سے بدعت ہر اس نئی چیز یا عمل یا عقیدہ کو کہا جاتا ہے جس کا وجود پہلے سے ثابت نہ ہو۔ مثلاً کلام الٰہی کے تیس پارے بنائے گئے۔ ہر پارہ میں رکوع قائم کیے گئے، قرآن کریم پر اعراب لگائے گئے، بلاک بنا کر چھاپنے اور جلد بندی کا کام شروع ہوا۔ حدیث شریف کو کتابی شکل دے کر احادیث کے مختلف مجموعہ جات کو مختلف نام دینا، احادیث کی اسناد بیان کرنا اور راویوں پر جرح کر کے ان کی قسمیں اور درجات یعنی صحیح وحسن وضعیف ومعضل ومرفوع وغیرہ بنانا، غرض علم حدیث کا مکمل فن اور فقہ کے اصول اور علم کلام اور ان کے تمام قاعدے ضابطے اور نماز کے لیے زبان سے بول کر نیت کرنا اور رمضان شریف میں بیس تراویح ادا کرنا، ایمان مجمل اور ایمان مفصل یاد کرنا اور کروانا، حج کے لیے اونٹوں کی بجائے بحری وہوائی جہازوں اور کاروں وبسوں پر بیٹھ کر سفر کرنا اور طریقت کے جملہ سلاسل ومشاغل اور مسائل، مراقبے، چلہ کشی وپاس انفاس اور تصور شیخ اور شریعت کے چاروں سلسلے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اور سلاسل طریقت قادری وچشتی وسہروردی اور نقشبندی اور دینی مدارس اور طریقہ حفظ قرآن اور اولیا کے عرس کا اہتمام کرنا، ختم

بخاری ودستار بندی اور مساجد میں باتنخواہ امام وموذن مقرر کرنا، مساجد کے گنبد ومینار اور رائے ونڈ اور شیر شاہ بائی پاس ملتان میں بڑے بڑے تبلیغی اجتماعات کرنا، آٹھ سالہ دورہ حدیث، درس نظامی اور اس کا تمام لٹریچر اور کتب نحو وصرف اور اسناد کا اجراوغیرہ، ان تمام کاموں کو بدعات حسنہ کہا جاتا ہے۔

جب آپ سے فون پر بات ہوئی تو آپ نے فرمایا تھا کہ حضرت مجددؒ بدعت حسنہ کو نہیں مانتے تھے۔ مہربانی فرما کر حضرت مجددؒ کی ان تحریرات وملفوظات ومکتوبات کے مکمل حوالے بتا دیجیے جہاں شیخ مجددؒ نے مذکورہ بالا جملہ امور کا رد لکھا ہو، جیسا کہ حضرتؒ نے زبان سے بول کر نماز کی نیت کرنے اور کفن میں پگڑی کے اضافے اور دستار کے شملے کو دائیں جانب چھوڑنے اور تشہد میں انگلی کھڑی کرنے پر کلام فرمایا ہے۔ کیا امام ربانیؒ نے طریقت کے چار سلاسل قائم کرنے اور تصور شیخ اور فقہ کے چاروں سلاسل اور کتب احادیث کی تدوین ودرجہ بندی اور مندرجہ بالا دیگر بدعات حسنہ کا انکار کیا ہے؟ اگر نہیں اور واقعی نہیں تو پھر آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مجددؒ بدعت حسنہ کو نہیں مانتے بلکہ اسے دین کی بنیادیں منہدم کر دینے کے مساوی قرار دیتے ہیں؟

ہوسکتا ہے جواباً آپ حضرت مجددؒ کی یہ عبارت پیش کریں: ’’کہنے والوں نے کہا ہے کہ بدعت دو قسم ہے، حسنہ اور سیئہ۔ حسنہ اس نیک عمل کا نام رکھتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدینؓ کے زمانہ کے بعد پیدا ہوئی ہو اور کسی سنت کو اٹھانے اور دور کرنے والی نہ ہو۔ اور سیئہ اس کو کہتے ہیں جو سنت کو مٹانے اور دور کرنے والی ہو۔ یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت کے اندر حسن ونورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا اور ظلمت وکدورت کے سوا کسی شے کا احساس نہیں ہوتا۔‘‘ (مکتوبات شریف حصہ سوم، دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۸۶)

سوچنے کی بات ہے کہ حضرت شیخ مجددؒ ایک طرف تو بدعت کی کسی قسم میں بھی نورانیت وحسن نہیں پاتے، جب کہ دوسری طرف شریعت وطریقت کے جملہ سلاسل کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ بذات خود سلسلہ نقشبندیہ سے نہ صرف منسلک ہیں بلکہ مکتوبات شریف میں جابجا اس میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں اور تصور شیخ کو مرید کے لیے ذکر الٰہی سے بھی بڑھ کر نافع قرار دیتے ہیں۔ (مکتوبات، حصہ سوم، دفتر اول، مکتوب ۱۸۷) حالانکہ یہ کام نہ تو آقائے دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور نہ ہی صحابہؓ سے اور نہ ہی تابعین سے ثابت ہیں۔ تو پھر کیا خاکم بدہن حضرت شیخ کے قول وفعل میں تضاد تھا؟ ہرگز نہیں بلکہ جسے علماء اسلام بدعت حسنہ قرار دیتے ہیں، اسے حضرتؒ سرے سے بدعت ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ اسے سنت سے ثابت سمجھتے ہیں۔ باقی رہ گئی بدعت ضلالہ تو اس میں حسن ونورانیت کہاں سے آسکتی ہے؟ کیوں کہ بدعت اسی کو کہتے ہیں جو پہلے سے ثابت نہ ہو۔

آپ نے جو یہ لکھا ہے، آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ ’’بدعت حسنہ کے نام پر ہر طرف بدعات ضلالۃ کا سیلاب بہہ رہا تھا‘‘ (الشریعہ، ص ۱۱) ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت مجددؒ نے بدعت حسنہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ بدعت حسنہ کا مقدس نام لے کر پیش کی جانے والی بدعات ضلالہ سے بیزاری کا اظہار فرمایا تھا۔ اندریں حالات حضرت مجددؒ نے بدعت حسنہ کی اصطلاح سے اجتناب فرمایا اور علماء اسلام کے موقف کو تقویت دینے کے لیے بدعت حسنہ کو سنت قرار دیا۔

ملا طاہر لاہوری کے نام مکتوب شریف میں حضرت مجددؒ نے برملا فرمایا ہے کہ ''سنت اور بدعت دونوں پورے طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے نقص ونفی کو مستلزم ہے، پس ایک کو زندہ کرنا دوسرے کو مارنے کو مستلزم ہے۔ یعنی سنت کو زندہ کرنا بدعت کے مارنے کا موجب ہے اور بالعکس۔ پس بدعت خواہ اس کو حسنہ کہیں یا سیئہ، رفع سنت کو مستلزم ہے۔'' (مکتوبات، حصہ چہارم، دفتر اول، مکتوب ۲۵۵) غور فرمائیں کہ مجددؒ نے کس قدر وضاحت کے ساتھ بتادیا ہے کہ ان کے نزدیک بدعت صرف اور صرف وہی ہے جو سنت کی ضد ہو نہ کہ سنت کے تحت یا اس کے مطابق۔ حضرت مجددؒ اسے بدعت تسلیم ہی نہیں کرتے جس کا اشارہ تک بھی سنت میں ملتا ہو۔ یعنی علمائے اہل سنت بدعت حسنہ اسے کہتے ہیں جس کی اصل سنت میں موجود ہو، گو اشارۃً ہی ہو۔ اس کی بہترین مثال حضرت فاروق اعظمؓ کا وہ قول ہے جو انہوں نے تراویح کی باقاعدہ جماعت کے اجرا پر فرمایا تھا کہ '' نعمت البدعة هذه '' تو بڑی اچھی بدعت ہے۔ تراویح کی جماعت کی اصل سنت نبوی میں ہونے کے باوجود حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر لفظ بدعت کا اطلاق فرمایا۔ امیر المومنینؓ کی اتباع میں ہم اہل سنت اس کے مماثل امور کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، لیکن حضرت مجددؒ اس کے لیے سنت کا لفظ زیادہ موزوں قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مجددؒ نے قیاس اور اجتہاد فقہی کو بدعت حسنہ کہنے کی سخت مخالفت فرمائی۔ (دیکھیے مکتوبات، حصہ سوم، دفتر اول، مکتوب ۱۸۶) یعنی آپ اسے بھی سنت میں داخل سمجھتے ہیں کیوں کہ قیاس اور اجتہاد کی بھی کچھ نہ کچھ اصل صدر اول میں ضرور ہوتی ہے۔ لہٰذا حضرت مجددؒ اسے سنت ہی قرار دیتے ہیں۔ اس طرح مجدد صاحبؒ اور اسلاف اہل سنت کی بات میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے۔

حضرت مولانا سعید احمد نقشبندیؒ نے اس مکتوب کے حاشیہ میں علامہ محمد مراد مکی محشی کی اسی مکتوب کے تحت حاشیہ میں لکھی گئی عبارت پیش کی ہے کہ ''اور اس بارے میں آپؒ کا قول علماء اسلافؒ کے اس قول کے مخالف نہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں، حسنہ وسیئہ۔ وہ بدعت حسنہ سے ایسی شے مراد لیتے ہیں جس کی صدر اول میں اصل موجود ہو، اگرچہ اشارۃً ہی ہو جیسے مسجدوں کے مناروں، مدارس اور مسافر خانوں کی تعمیر اور کتابوں کی تدوین اور دلائل کی ترتیب اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ اور بدعت سیئہ سے ایسی چیز مراد لیتے ہیں جس کی صدر اول میں بالکل اصل موجود نہ ہو۔ تو امام ربانیؒ قسم اول پر بدعت کے نام کا اطلاق نہیں کرتے، کیوں کہ اس کی اصل صدر اول میں موجود ہوتی ہے، لہٰذا وہ چیز بدعت اور محدث نہیں۔ بلکہ آپ بدعت صرف قسم ثانی کو قرار دیتے ہیں کیوں کہ وہی درحقیقت بدعت اور محدث ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔ تو علمائے اسلاف اور حضرت شیخ مجددؒ کے درمیان نزاع لفظی ہے کہ قسم اول پر بدعت کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ حضرت شیخ محمد مظہر دہلویؒ مقامات سعیدیہ میں فرماتے ہیں ''بدعت حسنہ امام ربانیؒ کے نزدیک سنت میں داخل ہے اور آپ بموجب حدیث ''کل بدعة ضلالة'' اس پر بدعت کا اطلاق نہیں فرماتے۔ اس بارے میں آپؒ اور دوسرے علماء کرام کے درمیان، جو بدعت حسنہ کے قائل ہیں، نزاع لفظی ہے۔ تو ہر بدعت جو مخالف سنت نہ ہو، علماء کے نزدیک وہی بدعت حسنہ ہے اور امام ربانی کے نزدیک وہ سنت میں داخل ہے۔ شاہ عبد الغنیؒ انجاح الحاجۃ حاشیہ ابن ماجہ میں حدیث ''من احدث فی امرنا هذا مالیس منه '' کے تحت فرماتے ہیں: ''یعنی وہ چیز جو دین کے وسائل میں نہ ہو کیوں کہ شے کا وسیلہ اور ذریعہ اس میں داخل ہوتا ہے، اسی لیے شیخ مجددؒ کے

نزدیک وہ علوم جو دین کے وسائل ہیں جیسے صرف ونحو سنت میں داخل ہیں اور آپ اس پر بدعت کا اطلاق نہیں کرتے، کیوں کہ امام ربانیؒ کے نزدیک بدعت میں کوئی حسن اور خوبی نہیں''۔

حضرت مولانا محمد سعید احمد نقشبندی مزید فرماتے ہیں: ''نیز معمولات اہل سنت کے مطابق امام ربانیؒ اپنے پیر ومرشد کی مجلس عرس شریف میں شریک ہوتے تھے۔ حضرات القدس ۲۹/۲ پر ہے کہ آپ بتقریب عرس حضرت خواجہؒ دہلی تشریف لائے۔ آپ خود اپنے مکتوبات شریف کے دفتر اول، جلد دوم، حصہ چہارم، مکتوب ۲۳۳ میں فرماتے ہیں کہ: ''درایام عرس حضرت خواجہ جیو قدس سرہ بحضرت دہلی رسیدہ بخاطر داشت کہ در ملازمت علیہ نیز برسد۔ دریں اثنا خبر کوچ منتشر گشت بضرورت توقف نمودہ۔'' حضرت خواجہ جیوؒ کے عرس مبارک کے ایام میں فقیر دہلی آیا اور ارادہ تھا کہ حضرت (شیخ فرید) کی خدمت عالی میں بھی حاضر ہو۔ آنے کی تیاری میں تھا کہ آپ کے تشریف لے جانے کی خبر مشہور ہو گئی تو ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ فوت شدگان کی فاتحہ دلاتے تھے اور ایصال ثواب کرتے تھے۔ مکتوبات شریف میں آپ کے اس عمل کی تصریح موجود ہے۔ مزارات بزرگان پر تشریف لے جاتے تھے اور قبر پر پڑے ہوئے اچھاڑ کو تبرک جانتے اور عقیدت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔'' (حضرات القدس ۷۹/۲)

مندرجہ بالا تحقیق سے خوب ثابت ہے کہ حضرت مجددؒ بدعت حسنہ کو سنت میں داخل سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ بدعت کا اطلاق عقائد باطلہ پر کرتے تھے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں: ''بدعتی گروہ جنہوں نے مختلف بدعات اختیار کی ہیں اور اہل سنت سے جدا ہوئے ہیں۔ ان تمام گروہوں کے درمیان فرقہ خوارج وروافض درست معاملہ اور حق سے دور جا پڑے ہیں۔ وہ گروہ جو اکابر دین کو گالیاں دینا اور طعن کرنا ایمان کا جز واعظم تصور کرتا ہو، ایمان سے کیا حصہ رکھے گا۔ روافض کے بارہ فرقے ہیں اور سب کے سب اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکفیر کرتے اور خلفاء راشدینؓ کو گالی دینا عبادت جانتے ہیں۔'' (مکتوبات، دفتر دوم، حصہ اول، مکتوب ۳۶)

اس عبارت سے خوب ثابت ہے کہ حضرت امام ربانیؒ نئے عقائد کو بدعت سمجھتے تھے جیسا کہ آپؒ نے خوارج وروافض کو بدعتی گروہ اور ان کے عقائد تقیہ وتبرا بازی وغیرہ کو بدعات قرار دیا ہے، جب کہ عقائد اہل سنت اور اہل تصوف کے مشاغل ومراقبے اور چلے اور عرس اور حضرات صوفیاء کرام کو کبھی بھی تنقید وتنقیص کا نشانہ نہیں بنایا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ آپ نے تو حضرت مجددؒ کو اولیاء ہندؒ کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا اور آپ کی ذات مقدسہ سے وہ کچھ منسوب کر ڈالا جو حضرت مجددؒ کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ بہر حال آپ کے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حضرت مجددؒ کے ہم عصر صوفیاء کرام سے لے کر آج تک کے قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی سلاسل کے جملہ صوفیاء کرام حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے وابستگی کو باعث فخر وبرکت سمجھتے ہیں۔ الحمد للہ۔

محمد یاسین عابد

علی پور چٹھہ

(۴)

جناب گرامی قدر مولانا عمار خان ناصر زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آنجناب معہ دیگر احباب بخیریت ہوں۔ مئی/جون ۲۰۰۹ء کا شمارہ ایک مولوی صاحب نے دکھلایا کہ دیکھیں شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے پوتے کیسے گمراہ ہوگئے ہیں۔ جب میں نے شمارہ دیکھا تو مجھے آنجناب سے عقیدت پیدا ہوگئی اور اسی شمارے سے اتنا متاثر ہوا کہ ایک پکا بریلوی عقائد کا ایڈووکیٹ اور معروف غیر مقلد مولوی صاحب اور ایک محقق شیعہ نوجوان عالم (جو تینوں میرے دوست ہیں) الشریعہ کے سالانہ خریدار بنا ڈالے اور وہ بھی متاثر ہوکر خریدار بنے ہیں، بلکہ الشریعہ کا حضرت شیخ الحدیثؒ نمبر بھی انہوں نے خریدا ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ سے راقم الحروف ناکارہ کو طویل عرصہ سے عقیدت تھی۔ حضرت کے چند مکتوبات گرامی جو اس ناکارہ کے نام ہیں، ان کی فوٹو کاپی ارسال خدمت ہے۔ حضرت مولانا عبدالحق خان بشیر دامت برکاتہم سے بھی عقیدت وتعلق ہے۔ حضرت نے اپنی جملہ مطبوعات ہدیۃً عنایت فرمائی ہیں، خط وکتابت بھی ہوتی ہے، حتیٰ کہ میری بیماری پر حضرت میری عیادت کو راقم اثیم کے غریب خانہ پر بنفس نفیس تشریف بھی لائے تھے۔ الشریعہ میں ان کا مضمون دیکھا اور آنجناب کا مضمون بھی بڑے شوق سے پڑھا۔ آنجناب کے موقف پر بڑی خوشی ہوئی۔ راقم آثم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ کی طرح اہل تشیع کے کفر کا قائل نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ سے خود اس ناکارہ نے یہ مسئلہ دریافت کیا تو مولانا تقی عثمانی صاحب نے فرمایا کہ شیعوں کو کافر نہیں کہتا، زیادہ سے زیادہ بدعتی کہتا ہوں۔

اگرچہ بعض کتب شیعہ میں تحریف قرآن کی روایات پائی جاتی ہیں، لیکن شیعہ عقائد کی کتابوں میں وہ تحریف قرآن کے قائل نہیں، جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد تفاسیر شیعہ علماء نے لکھی ہیں۔ تحریف قرآن کی لچر اور بے ہودہ روایات تو بعض کتب اہل سنت میں بھی موجود ہیں اور اہل سنت کی عقائد کی کتابوں میں شیعوں کو اسلامی فرقہ شمار کیا گیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ پر خود بھی کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے، وہ کیسے دوسروں کو کافر کہہ سکتے ہیں۔ میری اس عبارت کا مطلب یہاں دفاع تشیع نہیں ہے۔ ضمناً یہ بات اس عریضہ میں آگئی ہے۔

آنجناب نے مفتی عبدالغفار ارکانی صاحب کی جس کتاب کا تذکرہ فرمایا ہے، وہ کہاں سے دستیاب ہے؟ ہمارے ہاں مصیبت یہ ہے کہ ہمارے پرانے علماء کرام اسی پرانی تحقیق اور روش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں اور اسے ہی حرف آخر سمجھ رہے ہیں۔ اگر وہ حضرات باہر کی دنیا میں جھانک کر ملاحظہ فرمائیں اور کنویں کے مینڈک نہ بنیں اور روشن خیالی اور گمراہی تصور نہ فرمائیں تو شاید اس امت کے حالات درست ہوسکیں۔ آنجناب جیسے علمی خانوادہ سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام بھی اس خول سے باہر آنا چاہتے ہیں تو آنجناب پر گمراہی کے فتوے لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ نہایت افسوس ناک امر ہے۔ تاہم دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنجناب کو درازی عمر عطا فرماتے ہوئے دین مبین کی مزید خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

سید مہر حسین بخاری

بیت التوحید، کامرہ کلاں، ضلع اٹک

''دینی مدارس کا نظام بین الاقوامی تناظر میں''

[۱۷ راگست ۲۰۰۹ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ''دینی مدارس کا نظام بین الاقوامی تناظر میں'' کے زیر عنوان ایک فکری نشست منعقد ہوئی جس میں اقبال انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ممتاز احمد اور ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ کے استاد ڈاکٹر افتخار اقبال نے گفتگو کی، جبکہ الشریعہ اکادمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر محمد عمار خان ناصر نے نقابت کے فرائض انجام دیے۔ اس تقریب کی روداد افادۂ عام کے لیے یہاں شائع کی جا رہی ہے۔]

محمد عمار خان ناصر

دینی مدارس کا نظام اور ان کا سماجی کردار، یہ اس وقت ہر سطح پر، ملکی سطح پر اور بین الاقوامی سطح پر بہت زیادہ زیر بحث آنے والا موضوع ہے۔ تعلیم کے دائرہ میں، سیاست کے دائرے میں ہے اور بین الاقوامی سطح پر تہذیب وثقافت کی جو ایک کشمکش ہے، اس دائرے میں بھی ان مدارس کے نصاب ونظام کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے ہم مختلف عنوانات پر وقتاً فوقتاً کئی پروگرام منعقد کر چکے ہیں جن میں دینی مدارس کے نصاب ونظام اور ان کے معاشرتی کردار کے مختلف پہلو زیر بحث آتے رہے ہیں۔ چند ماہ پہلے خاص طور پر تدریس حدیث کے منہج اور اس میں کن کن پہلوؤں سے بہتری پیدا کرنے کی گنجائش ہے، اس عنوان پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی مختلف موضوعات پر نشستیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ کافی عرصے سے ہماری خواہش تھی کہ دینی مدارس کے کردار کا وہ تناظر بھی سامنے لایا جائے جو بین الاقوامی سطح پر زیر بحث آتا ہے اور جو بین الاقوامی سطح پر پالیسی سازوں اور مفکرین کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ ظاہر ہے کہ نصاب کے جو فنی اور تعلیمی پہلو ہیں، وہ بین الاقوامی سطح پر اس طرح دلچسپی کا موضوع نہیں ہیں، لیکن دینی مدارس کا ایک سماجی کردار ہے، معاشرے کی اسلامی تشکیل میں ان کا ایک کردار ہے جو سیاسی لحاظ سے بھی، تہذیبی لحاظ سے بھی اور عالم اسلام اور مغرب کے مابین فکری کشمکش کے لحاظ سے بھی بین الاقوامی سطح پر بحث ومباحثہ کا موضوع ہے۔ یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آنا چاہیے کہ مغرب کے لوگ جو اپنے زاویے سے اس پورے سسٹم کو دیکھتے ہیں اور اس کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کا کیا نقطہ نظر ہے؟ ان کے تحفظات کیا ہیں؟ ان کی طرف سے تبدیلی، بہتری اور اصلاح کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے، اس کا پس منظر کیا ہوتا ہے؟

ہمارے نہایت محترم بزرگ ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب گزشتہ کم وبیش پینتیس سال سے اس موضوع پر اور خاص طور پر پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے دینی مدارس کے کردار کے حوالے سے تحقیق کر رہے ہیں۔ کافی عرصہ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ ہیمپٹن یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے شعبے میں استاد ہیں اور آج کل بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے ایک ذیلی ادارے ''اقبال انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ'' کے ڈائریکٹر کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دینی مدارس کے نصاب ونظام اور اس کے مختلف پہلوؤں پر ان کے تحریری مقالات، مونوگراف بھی چھپ چکے ہیں۔ کافی سالوں سے ہمارا ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب سے رابطہ بھی ہے اور ہماری یہ خواہش اور کوشش رہی کہ کسی موقع پر ان کو زحمت دی جائے کہ وہ تشریف لائیں اور ان کے مشاہدات اور مطالعہ وتجزیہ سے ہم مستفید ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت میں عنایت کیا۔ ان کے ساتھ بنگلہ دیش سے ہمارے معزز مہمان ڈاکٹر افتخار اقبال صاحب بھی تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں انہوں نے ۲۰۰۵ء میں پی ایچ ڈی کی ہے اور ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ میں تدریس کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ وتحقیق کا خاص موضوع بھی یہ ہے کہ بنگلہ دیش میں مدارس کا نظام کیا ہے اور وہ قومی حوالے سے کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب کی عنایت سے ہمیں ان کو بھی یہاں زحمت دینے کا موقع ملا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا، ان کے ادارے کا اور ان کے رفقا جناب عمر قذافی صاحب اور جناب محمد اسماعیل صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی توجہ اور تعاون سے آج کی اس نشست کا انعقاد ممکن ہوا۔

ڈاکٹر ممتاز احمد

سب سے پہلے میں عزیز محترم عمار کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کچھ ٹوٹے پھوٹے خیالات آپ کے سامنے پیش کر سکیں۔ ایک مدت سے میری خواہش تھی کہ میں ''الشریعہ اکادمی'' میں حاضر ہوں۔ میں ان کے والد معظم مولانا زاہد الراشدی کے مداحوں میں سے ہوں۔ صرف ایک بار اسلام آباد میں میری ان سے ملاقات ہوئی، لیکن ایک ہی ملاقات میں انہوں نے میرا دل موہ لیا اور اس کے بعد ان کی تحریروں کو دیکھ کر ایک طرح سے میرے دل میں ان کے لیے محبت پیدا ہوتی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت پاکستان کی دینی صحافت میں جس قدر خوبصورت نثر لکھنے والے یہ دونوں باپ بیٹا ہیں، میرے نزدیک بہت کم اس پائے کی نثر دینی صحافت میں لکھی جا رہی ہے بلکہ ادبی صحافت میں بھی اس کی مثال کم ملتی ہے۔

دوسری چیز مجھے جو ''الشریعہ اکادمی'' اور اس کے لکھنے پڑھنے والے لوگوں میں نظر آئی اور جو پاکستان کے کسی بھی دینی حلقے اور کسی بھی مدرسے میں مجھے دیکھنے میں نظر نہیں آئی، وہ ہے اختلاف رائے کو رواداری کے ساتھ قبول کرنا، دوسرے کی رائے کو احترام کے ساتھ سننا، اگر اس سے اتفاق نہ ہو تو نہایت ہی احترام کے ساتھ اس سے اختلاف کا اظہار کرنا۔ یہ ایک ایسی خوشگوار اور ایسی حیرت انگیز روایت اس ادارے نے قائم کی ہے کہ آپ کو پورے پاکستان میں

اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ آپ پورے پاکستان کے مدارس کو دیکھ لیں۔ پورے پاکستان کے علمی خانوادوں کو دیکھ لیں۔ آپ کو یہ روایت نہیں ملے گی کہ باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے ساتھ دینی اور علمی مسائل پر برسر بحث ہیں، ایک دوسرے سے اختلاف کا اظہار کر رہے ہیں اور محبت اور احترام کا رشتہ پھر بھی قائم ہے۔ کیا آپ کسی عام مدرسے میں اس کا تصور کر سکتے ہیں؟ میرے نزدیک ناممکن ہے اور یہ اتنی خوشگوار اور حیرت انگیز چیز ہے کہ اس کی جتنی بھی قدر کی جائے، وہ کم ہے۔ اس وجہ سے کہ ہمارے ہاں لوگ اختلاف رائے کی بنیاد پر نہ صرف ذاتی دشمنیاں بنا لیتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں اور یہاں صورت یہ ہے کہ ایک ہی گھر میں باپ اور بیٹا ایک دوسرے کے ساتھ علمی اور دینی مسائل پر بحث ومباحثہ کر رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کے لیے احترام اور محبت کا اور باپ بیٹے کا رشتہ وہی ہے جو روایتی طور پر ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں اس کی کوئی اور روایت نہیں ملے گی۔

تیسری چیز جو اس ادارے میں، میں نے دیکھی، وہ یہ کہ علمی مسائل پر از سرنو بحث کرنے اور گفتگو کرنے سے ڈر اور خوف نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کچھ مسائل کو چیک؟؟ بنا لیا گیا ہے اور کچھ مسائل کو ہم نے قالینوں کے نیچے دبا کر رکھا ہوا ہے کہ اس کا تو نام بھی نہ لو۔ الشریعہ وہ پرچہ ہے جس میں دین کے اکثر علمی اور مذہبی مسائل پر کھل کر بحث ہوتی ہے اور لوگوں کو اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کے مواقع دیے جاتے ہیں۔ الشریعہ وہ پرچہ ہے جس میں الشریعہ میں لکھنے والوں کے خلاف، ان کی اپنے رائے کے خلاف لوگوں کی چیزیں چھپتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ ہماری دینی روایت کا بہت ہی قیمتی اثاثہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو مزید استحکام اور ترقی بخشے اور مولانا زاہد الراشدی اور ان کے بیٹے عمار کی کوششوں میں برکت دے اور اس روایت کو باقی جگہوں پر بھی پھیلانے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہو۔

میں عمار کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہمیں دعوت دی، یہ فورم مہیا کیا اور اتنے اچھے لوگوں سے ملنے کا موقع دیا۔ میرا تعلق انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک ادارے ''اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ'' سے ہے۔ یہ ادارہ چند سال پہلے قائم کیا گیا تھا اور اس ادارے کے قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عالم اسلام اور پاکستان کو جو مسائل درپیش ہیں، ان مسائل پر لوگوں کو وعظ کر کے اپنی رائے کو ان او پر ٹھونسنے کے بجائے اسلامی نقطہ نظر سے گفتگو کی جائے، مکالمے کیے جائیں، لوگوں کی باتیں سنی جائیں اور ان باتوں کی روشنی میں ایک اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر اتفاق رائے نہ بھی ہو سکے تو یہ کوئی بری بات نہیں ہوگی۔ یہی بہت ہوگا کہ ہم نے لوگوں کی بات سنی اور انہوں نے ہماری بات سنی۔ مسائل کی کچھ تشریح ہوئی، لوگوں کے اندر اور خود ہمارے اندر اس بات کا شعور پیدا ہوا کہ یہ وہ مسائل ہیں جن کا سامنا اس وقت عالم اسلام کو کرنا پڑ رہا ہے اور جن پر ایک تسلسل کے ساتھ گفتگو کرنا ضروری ہے۔ ان میں جمہوریت کا مسئلہ ہے۔ انسانی حقوق کا مسئلہ ہے۔ دہشت گردی کا مسئلہ ہے۔ ریڈیکل ازم (Redicalism) کا مسئلہ ہے، Terrorism کا مسئلہ ہے اور اس کے علاوہ دوسرے بہت سے مسائل ہیں۔ مغرب سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ جدیدیت اور اسلام کے درمیان تعلقات کی نوعیت

کیا ہوگی؟ آج کی سیاست میں مسلمانوں کا رول کیا ہونا چاہیے؟ پاکستان کی حد تک ریاست اور معاشرے کے تعلقات کو اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر کیسے استوار کیا جا سکتا ہے؟ معیشت میں، معاشرت میں، قانون میں، زندگی کے ہر میدان میں ہم اسلام کی تعلیمات پر کس طرح عمل پیرا ہو سکتے ہیں جس سے اسلام کی صحیح روح ہمارے سامنے واضح ہو۔ اسلام کے بارے میں یہ جو تصور عام کر دیا گیا ہے کہ اسلام کا مقصد صرف ہاتھوں کو کاٹنا، سنگسار کرنا، پتھر مارنا، کوڑے مارنا اور لوگوں کی گردنیں کاٹنا اور خودکش حملے کرنا اور ہائی جیکنگ کرنا ہے۔ یہ اسلام نہیں ہے، بلکہ اسلام وہ ہے جو ہمیں آپس میں محبت، بھائی چارہ، حسن سلوک، حسن اخلاق، صبر اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ تو یہ ''اقبال انسٹیٹیوٹ'' کا مقصد ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم بے شمار کام کرتے ہیں۔ پبلک لیکچرز کا اہتمام کرتے ہیں، سیمینارز کرتے ہیں، کانفرنسز کرتے ہیں۔ جس طرح آج کی نشست ہوئی ہے، اس طرح کی نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ کچھ پبلی کیشنز بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ آپ میں سے جو بھی اسلام آباد آئے تو ہمارے ادارے ''اقبال انسٹیٹیوٹ'' کا ضرور وزٹ کرے۔ ہمارا دفتر فیصل مسجد کے کیمپس میں ہے۔ اور جو شخص بھی ہمیں جہاں اور جس وقت بلانا چاہے، ہم خود حاضر ہونے کے لیے تیار ہیں۔

ان ابتدائی کلمات کے بعد اب میں کچھ گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔

آج کل کے اخبارات میں آپ بھی دیکھ رہے ہیں، آپ کو خود بھی اندازہ ہوگا کہ امریکی معاشرے میں کیا ہو رہا ہے۔ سب سے اہم خبریں جو امریکی اخبارات میں اور پھر ان کی وساطت سے پوری دنیا کے دوسرے اخبارات میں چھپ رہی ہیں، وہ امریکی معیشت اور امریکی اقتصادی کساد بازاری سے متعلق ہیں۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ امریکہ کے بینک ناکام ہو گئے ہیں، امریکی انشورنش کمپنیاں ناکام ہو گئیں اور سالانہ امریکی خسارہ ایک ٹریلین ڈالر یعنی ایک ہزار ارب ڈالر ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ امریکا کو دو بلین ڈالر روزانہ چین سے لینا پڑتا ہے اور جب تک امریکا کو چین سے یہ قرضہ نہ ملے، اس وقت تک اس کی معیشت نہیں چل سکتی۔ یہ سپر طاقت کی معیشت کا حال ہے کہ چینی قرضوں کے بغیر گزارا نہیں ہے۔

اس سب کے باوجود امریکہ میں ایک انڈسٹری ایسی ہے جو گزشتہ سات آٹھ سال سے مسلسل بڑھ رہی ہے، ترقی کر رہی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سی انڈسٹری ہے؟ وہ ہے اسلام کی انڈسٹری۔ اسلام پر جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ٹیلی ویژن پروگرام ہو رہے ہیں، سیمینارز ہو رہے ہیں، کانفرنسز ہو رہی ہیں اور یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی و تصنیفی کام ہو رہے ہیں، ان کے حجم کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے میں اس کو اسلام انڈسٹری کہتا ہوں۔ اس انڈسٹری میں بہت کام ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں پہلی بار امریکہ گیا تو یونیورسٹی آف شگاگو کے بک اسٹور میں یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ اسلام کے متعلق کتنی کتابیں ہیں۔ وہاں ایک سیکشن تھا جس پر World Religions لکھا ہوا تھا۔ اس میں خاصی بڑی تعداد میں کتابیں تھیں۔ سب سے زیادہ عیسائیت کے متعلق، پھر یہودیت اور پھر ہندو مذہب کے متعلق۔ اس وقت مجھے یونیورسٹی آف شگاگو کے بک اسٹور میں اسلام کے متعلق صرف تین کتابیں ملیں۔ یہ وہ یونیورسٹی

ہے جو تحقیقی سطح کی یونیورسٹی ہے۔ لیکن آپ اگر آج یونیورسٹی آف شکاگو میں جائیں تو تین چار بڑے شیلف اسلام سے متعلق کتابوں سے آپ کو بھرے ہوئے نظر آئیں گے۔

جب ۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ پیش آیا تو اس کے فوراً بعد دو تین مہینے کے اندر قرآن مجید کے تقریباً پچاس لاکھ نسخے امریکہ میں فروخت ہوئے۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ امریکہ میں اتنی تعداد میں لوگوں نے قرآن مجید خریدا، لیکن اس میں بے وقوفی کی اور بری بات یہ ہے کہ نائن الیون کے واقعے کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے ایک دفعہ ایک امریکی سے میں نے سوال کیا کہ نائن الیون کے واقعہ کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید کو کیوں پڑھا جا رہا ہے؟ کیا جن لوگوں نے طیارہ ہائی جیک کیا، انھوں نے قرآن مجید میں یہ پڑھا ہوگا کہ کس طرح ہائی جیک کرنا ہے؟ بہر حال امریکی عوام میں یہ تجسس ضرور پایا جاتا ہے کہ ہم دیکھیں تو سہی کہ وہ کون سی کتاب ہے جو مسلمانوں کو اس طرح کے دہشت گردی کے کاموں پر اکساتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر بری بات میں اچھی بات بھی نکل آتی ہے۔ اس طرح اسلام کے متعلق نہایت اچھی اور اسی طرح الٹی سیدھی، جو کتاب بھی لکھی گئی، اس کو امریکہ کے پبلشرز نے چھاپنا شروع کر دیا۔

۲۰۰۵ء میں، میں نے امریکہ کا جو ہائیر ایجوکیشن کا میگزین ہے جو عام طور پر یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے ہوتا ہے، اس کے چار پانچ شمارے دیکھے۔ اس میں جتنی Jobs خالی تھیں، وہ اسلامیات کے اساتذہ کے لیے تھیں اور لکھا ہوا تھا کہ ہمیں اس وقت اسلامک اسٹڈیز پڑھانے کے لیے ایک پروفیسر چاہیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں کوئی بندہ بھی نہیں ملا تو اسلامک اسٹڈیز پڑھا سکے۔ سعودی عرب کے ایک شہزادہ ہیں، پرنس ولید جنھوں نے بہت سا پیسہ جوا کھیل کر کمایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں امریکی یونیورسٹیوں میں اسلام پڑھانے کے لیے پچاس ملین ڈالر دیتا ہوں۔ بیس پچیس ملین ڈالر انہوں نے جارج ٹائن یونیورسٹی کو اور بیس پچیس ملین ڈالر ہارورڈ یونیورسٹی کو دیا۔ ایک صاحب مجھ سے مشورہ لے رہے تھے کہ کون سی یونیورسٹی کو پیسہ دیں۔ میں نے کہا کہ پرنس ولید کو رقم دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام امریکہ کی اپنی ضرورت ہے اور مجبوری ہے اور اب اسلام ایک حقیقت بن چکا ہے۔ وہ اس پر خرچ کریں گے اور سعودی عرب کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام اب ان کے گلے کی ایک ہڈی بن چکا ہے، اس کو اگلنے یا نگلنے دونوں کے لیے ان کو اپنے وسائل اور ذرائع خرچ کرنے پڑیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہارورڈ کی اپنی Endowment تیس چالیس بلین ڈالر کی ہے تو پرنس ولید کے بیس بائیس ملین ڈالر کی کیا حیثیت ہے؟ یہ تو سمندر میں قطرے کے برابر ہے۔ بہر حال سعودیوں کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے۔ انہوں نے پیسے دے دیے۔

یہ اسلام انڈسٹری ہے اور اس انڈسٹری کا مرکز نگاہ مدرسہ ہے۔ اب امریکہ میں صحافت کے میدان میں، یونیورسٹی کے میدان میں ہر شخص مدارس کے موضوع پر اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور ہر شخص مدارس کے نظام تعلیم پر اس طرح اتھارٹی سے بات کرتا ہے جیسے وہ دارالعلوم یا بنوری ٹاؤن سے پڑھا ہوا ہو۔ ایک دفعہ ہیلری کلنٹن نے سینٹ میں مدارس کے بارے میں بات کی تو میں ٹیلی ویژن پر سن رہا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا، ایسا لگتا ہے جیسے یہ بنوری ٹاؤن کی پڑھی ہوئی ہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز ایسا ہی تھا کہ مدرسوں میں یہ ہو رہا ہے اور وہ ہو رہا ہے۔

ایک اور بات یہ کہ وہاں کے لوگوں کی مدارس کے بارے میں جو باتیں ہیں، کچھ تو وہ ہیں جو سنی سنائی ہیں اور کچھ وہ باتیں ہیں جو یہاں کے صحافی لکھتے ہیں اور وہ ان کو پڑھتے ہیں۔ وہ ہمارے پاکستانی صحافیوں کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے پاس مدارس کے بارے میں جاننے کے لیے کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پاکستان میں موجود کچھ صحافی ہیں، وہ لکھتے ہیں اور وہ ان کو پڑھتے ہیں۔ اب یہ سارے صحافی جو انھیں بتا رہے ہیں کہ مدرسہ میں کیا ہو رہا ہے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان میں سے کسی نے بھی آج تک مدرسہ میں قدم تک نہیں رکھا۔ لیکن وہ بڑے تیقن کے ساتھ ایسے لکھتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے ان لوگوں نے ساری زندگی مدارس میں Study کرنے میں لگائی ہو۔ یہ لوگ غلط سلط باتیں لکھتے ہیں اور جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس کو لندن ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ چھاپ دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ لوگ اس کو پالیسی پڑھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کیا ان کے خیالات بنیں گے۔

اس کی چند مثالیں دیتا ہوں۔ نیویارک میں دو سال پہلے ایک اسکول خلیل جبران اکیڈمی کے نام سے تھا اور یہ خلیل جبران ایک لبنان کے سیکولر رومانی شاعر تھے۔ نیویارک میں کچھ عرب عیسائیوں نے ایک اسکول قائم کیا جس میں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ امریکہ میں میٹرک کی تعلیم میں لازم ہوتا ہے کہ غیر ملکی کم از کم دو زبانیں جرمن، فرنچ یونانی اور اٹالین وغیرہ سیکھیں۔ انہوں نے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ خلیل جبران اکیڈمی میں عربی زبان کو بھی ساتھ شامل کر لیا، کیوں کہ اس میں عرب زیادہ تھے۔ اس پر یہ شور مچ گیا کہ اب نیویارک میں مدرسہ قائم ہو گیا ہے۔ نیویارک کی سٹی کونسل اس کے پیچھے پڑ گئی، اس کی پرنسپل کو استعفا دینا پڑا اور اس ادارے کو جو امداد مل رہی تھی، روک لی گئی۔ پچھلے سال میں نے پڑھا کہ اس کی جو پرنسپل تھی، اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی لیکن معلوم ہو گیا تو بچ گئی۔

اس کے علاوہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب صدر اوباما انتخابی مہم چلا رہے تھے تو ان کے خلاف کسی نے شور مچا دیا کہ وہ پانچ سال کی عمر میں انڈونیشیا گئے تھے اور سی این این نے یہ خبر لگا دی کہ یہ تو مدرسہ کا پڑھا ہوا آدمی ہے اور شاید ان کے گمان میں ان مدارس میں بم بنائے جاتے ہیں اور تعلیم نہیں دی جاتی۔ بہر حال اس کے بعد صدر اوبامہ اور اس کی بیوی نے مسلسل دو ماہ تک تردید کی کہ انڈونیشیا میں جو اسکول ہوتا ہے، اس کو مدرسہ کہا جاتا ہے اور اس میں جنرل ایجوکیشن ہوتی ہے جس میں میتھ، بیالوجی وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے پہلے امریکہ میں اور مغرب میں کوئی شخص بھی مدرسہ سے واقف نہ تھا۔ میں نے ۱۹۷۵ء میں مدارس پر کام کرنے کا ارادہ کیا اور مغربی پاکستان میں بھی کچھ مدارس کا چکر لگایا۔ میرے خیال میں اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ مدرسہ کس چڑیا کا نام ہے۔ نائن الیون کے بعد امریکہ کی رینج میں اچانک مدرسہ آ گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انیس ہائی جیکرز جنہوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کیا تھا، ان میں سے کوئی بھی مدرسہ کا پڑھا ہوا نہ تھا۔ آپ ان انیس کی لسٹ دیکھ لیں۔ ان میں سعودی تھے، کویتی تھے اور جرمن تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عطا محمد جس نے پہلا حملہ کیا، وہ جرمنی کی کسی انجینئرنگ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا تھا۔ پھر وہاں پر یہ بات ہو رہی تھی کہ طالبان مدرسوں کے پڑھے ہوئے ہیں اور یہ دہشت گردی کر رہے ہیں، دہشت گرد پیدا کر رہے ہیں، اس لیے ان مدارس کو بند کر دینا چاہیے۔ میں نے ایک

شخص سے کہا کہ بھائی! یہ دیکھو کہ عطا محمد تو ایک جرمن یونیورسٹی کا پڑھا ہوا تھا تو کیا آپ اس یونیورسٹی کو بند کر دیں گے؟ اس لیے کہ سب سے بڑا دہشت گرد تو وہی تھا جس نے first attack کیا۔ اس کے بعد دیکھیں! خالد شیخ محمد کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ بہت معروف آدمی ہے اور راولپنڈی میں پکڑا گیا ہے۔ اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور کہتے ہیں کہ اب بھی معترف ہے کہ وال اسٹریٹ جرنل کے جرنلسٹ کی ہلاکت میں اس کا ہاتھ تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ نائن الیون کی اوریجنل پلاننگ بھی اسی نے کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ خالد شیخ محمد کہاں کا پڑھا ہوا ہے؟ بنوریہ کا یا حقانیہ کا یا دارالعلوم کا نہیں، لندن اسکول آف اکنامکس کا جو لندن کا سب سے ممتاز ادارہ ہے۔ تو میں لوگوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ اگر آپ کا معیار یہ ہے کہ ہر وہ ادارہ جس سے کوئی دہشت گرد پڑھ کر نکلا ہے، اس پر پابندی لگا دینے چاہییں تو ٹونی بلیئر صاحب کو سب سے پہلے لندن اسکول آف اکنامکس کو بند کر دینا چاہیے جس نے سب سے بڑا دہشت گرد پیدا کیا ہے۔

اس طرح کی بہت سی باتیں مغرب میں زیر بحث آتی رہتی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مغرب میں، وہاں کے پریس میں، وہاں کے اداروں میں اور عام پبلک میں کس طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ طالبان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ سب کے سب مدارس کے پڑھے ہوئے ہیں اور خاص طور پر شمال مغرب کے صوبہ کے جو مدارس ہیں، وہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق پاکستان کے سارے مدارس طالبان ہی کی طرح کے لوگ پیدا کر رہے ہیں جو لڑتے ہیں، گولیاں چلاتے ہیں، راکٹ چلاتے ہیں، جو لوگوں کو کوڑوں کی سزا دیتے ہیں، بم بناتے ہیں، جھگڑتے ہیں، لوگوں کے گلے کاٹتے ہیں، پتھروں سے سنگسار کرتے ہیں۔ صبح ایک آدمی کو پکڑا اور ایک آدھ گھنٹہ اس سے تفتیش کی، اگلے آدھ گھنٹے میں اس کا سر قلم کر دیا۔ بس جی انصاف ہوگیا۔ تو اس طرح کا تاثر پایا جاتا ہے کہ طالبان چونکہ پاکستان کے مدارس کے پڑھے ہوئے ہیں، اس لیے سارے پاکستان کے مدارس طالبان ہی پیدا کر رہے ہیں۔ یہ تاثر بہت گہرا اور مضبوط ہے۔

جب واشنگٹن یا امریکہ کے دوسرے شہروں میں اس طرح کی کانفرنسز ہوتی ہیں تو میں کہتا ہوں کہ دیکھیں آپ کو دو چیزوں کے بارے میں بنیادی فرق کرنا پڑے گا۔ پاکستان میں ایک تو وہ مدارس ہیں جو پاکستان بننے سے پہلے موجود تھے اور پاکستان بننے کے بعد اس میں ایک تدریجی ارتقا ہوا۔ طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی تو پورے پاکستان میں، سندھ میں، سرحد میں، بلوچستان میں، پنجاب میں اور آزاد کشمیر میں ایک تدریجی رفتار کے ساتھ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہ وہ مدارس ہیں جو خالص دینی تعلیم کے لیے بنائے گئے اور ان میں سوائے دینی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا تو اس کی مزاحمت کے لیے کچھ افغان مجاہدین کے گروپ منظم کیے گئے۔ یہ آپ سب جانتے ہیں کہ پانچ یا چھ گروپوں کو منظم کیا گیا اور ان مجاہد تنظیموں کا ہیڈ کوارٹر پشاور تھا۔ ان کو تائید حاصل تھی پاکستان حکومت کی، سعودی حکومت کی، آئی ایس آئی کی، برٹش حکومت کی اور سب سے بڑھ کر امریکہ کی تائید حاصل تھی۔ اس دوران جو افغان مہاجرین پاکستان میں آئے ہوئے تھے، ان کی تعداد ایک اندازہ کے مطابق ۵ ملین کے لگ بھگ تھی۔ پچاس لاکھ کے لگ بھگ افغان مہاجرین پاکستان میں پشاور اور

بلوچستان کے بارڈر پر موجود تھے۔ان کے لیے رہائشی کیمپ لگائے گئے اور اس کے لیے مسلمان ممالک نے امداد دی۔

اس وقت سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ جو مہاجرین ہیں، ان کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کیا ہوگا۔ ان مہاجرین کے کیمپ میں اسکول کھولے گئے۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسکول کس کی مدد سے کھولے گئے؟ یہ اسکول سعودی عرب کی امداد سے اور امریکی ڈالر کی امداد سے کھولے گئے اور ان سکولوں میں دو چیزیں مقصود تھیں، بلکہ میرے خیال میں تعلیم وہاں ثانوی مقصد تھا جبکہ پہلا مقصد وہاں نوجوان افغان مہاجرین کو جہاد کے لیے اور سوویت یونین کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کرنا تھا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ مدارس جو مہاجرین کے کیمپ میں قائم کیے گئے، مدارس نہیں تھے جہاں تعلیم دی جاتی تھی بلکہ یہ پاکستان اور افغان سرحد پر قائم کیے گئے جنگی کیمپ تھے جہاں جنگی تربیت دی جاتی تھی۔ ان کو مدارس کا نام دے دیا گیا۔ ان اداروں کا بنیادی تشخص تعلیم تھا ہی نہیں، ان اداروں کا بنیادی تشخص لڑاکا فوج کو تیار کرنا تھا جو امریکی ڈالر لے کر، سعودی ریال لے کر، پاکستانی آئی ایس آئی کا روپیہ لے کر افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ کریں جو ایک اچھا مقصد تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سوویت یونین کو نکالنے کا اچھا مقصد نہیں تھا۔ لیکن دیکھیں، ہو کیا رہا ہے۔ یہ ادارے تیار کیے جا رہے ہیں سوویت یونین کے خلاف جہادی تیار کرنے کے لیے، جنگجو تیار کرنے کے لیے اور اس کو مذہبی جواز دینے کے لیے ان اداروں کا نام ٹریننگ سنٹر نہیں رکھا جاتا بلکہ مدرسہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو لڑاکا فوج تیار ہوتی ہے، اس کو ہم کہتے ہیں کہ مدارس جنگجو تیار کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ''مدارس'' کس نے قائم کیے؟ کس کا پیسہ لگا تھا؟ برطانیہ کا پیسہ لگا تھا، سعودیوں کا پیسہ لگا تھا، امریکہ کا پیسہ لگا تھا۔ اگر یہ آگ ہے تو امریکہ کی لگائی ہوئی ہے۔ میں ان لوگوں سے صاف کہتا ہوں کہ آپ لوگ اس سے بری الذمہ نہیں ہیں۔ باقی جن دینی مدارس کا بنیادی تشخص حقیقتاً مدرسے کا ہے، وہ بالکل اس سے الگ تھلگ رہے۔ وہ تو قال اللہ وقال الرسول کی بات کرتے رہے۔

۸۳۔۱۹۸۴ء کی بات ہے۔ میں یونیورسٹی آف اٹلانٹا میں گیا تو وہاں ایک امریکی پروفیسر ہیں جان سٹرے۔ وہ افغانستان میں تین چار سال رہے۔ انہوں نے وہاں پشتو بہت اچھی سیکھی، دری بھی سیکھی۔ دری وہ ایسے بولتے تھے جیسے ایک Native آدمی بولتا ہے۔ افغانستان سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ وہاں ایک کانفرنس تھی۔ میں وہاں گیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ USIG کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ۲۵ ملین ڈالر دیے گئے ہیں کہ پاکستان میں افغان مہاجرین کے جو اسکول چل رہے ہیں، ان کے لیے نصابی کتاب تیار کریں۔ ذرا خیال فرمائیے! افغان مہاجرین کے بچوں کو جو کتابیں پڑھائی جانے والی تھیں، وہ کہاں تیار ہو رہی ہیں؟ امریکہ میں۔ ان نصابی کتابوں کو تیار کرنے کے لیے پیسہ کون دے رہا تھا؟ امریکہ کا اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ۔ تیار کرنے والے کون تھے؟ امریکی۔ چنانچہ پہلی جماعت کے لے کر پانچویں جماعت تک کے لیے نصابی کتابیں اس زمانے میں تیار ہوئیں۔ اس قاعدے کو دیکھنے کا موقع اس خاکسار کو بھی ملا ہے۔ اس میں الف، A سے اللہ ہے جس میں ظاہر ہے کہ کوئی بری بات نہیں ہے لیکن ب، B سے بندوق ہے۔ K سے کلاشنکوف ہے۔ J سے جہاد ہے۔ T سے ٹینک ہے۔ R سے Russian Soldier ہے اور R سے Rocket ہے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہیں۔ پورے کا پورا قاعدہ ہے جو بچوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

تو لڑنے جھگڑنے کی اور دہشت گردی کے لیے ذہن سازی کون کر رہا ہے؟ ہم نے تو نہیں کی۔ یہ امریکیوں نے کی ہے۔اس کے بعد کہتے ہیں کہ مدارس سے جو لوگ نکلتے ہیں، بہت ہی لڑاکا ہوتے ہیں، ان میں رواداری نہیں ہوتی۔ آپ خود بتائیں جس نے T سے ٹینک پڑھا ہو اور S سے Suicide Bombing پڑھا ہو اور K سے کلاشنکوف پڑھا ہو، کیا اس سے آپ امن کی، رواداری کی، صلہ رحمی کی، حسن اخلاق کی توقع رکھ سکتے ہیں؟

تو یہ صورت حال ہے۔ جب امریکہ کے لوگ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ مدارس سے ایسی نسل نکل رہی ہے جو جنگجو ہے اور دہشت گرد ہے تو میں ان سے کہتا ہوں کہ جناب! یہ پھل آپ کا لگایا ہوا ہے۔ یہ پودا آپ کا لگایا ہوا ہے جو اب بار آور ہو کر آپ کے خلاف تیار ہے۔

ایک اور چیز کہی جاتی ہے کہ مدارس میں جہاد اور قتال کی تعلیم دی جاتی ہے، دوسروں سے نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے، فرقہ واریت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں، امریکہ سے اور مغرب سے نفرت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہ تاثر ہے امریکہ کا مدارس کے بارے میں کہ پاکستان کے مدارس میں کوئی پڑھائی وغیرہ نہیں ہوتی، صرف جنگ کی تربیت دی جاتی ہے۔ گویا ہر مدرسہ ایک ملٹری ٹریننگ کیمپ ہے۔ نیویارک سے ایک امریکی افسر ۱۹۹۰ء میں پاکستان آیا اور مدرسہ حقانیہ میں مولانا سمیع الحق صاحب سے ملاقات کی۔ نیویارک ٹائمز کے فرنٹ پیج پر اس نے ایک Story لکھی اور اس کا نام رکھا: University of Jihad۔ اسی طرح اس نے دار العلوم بنوری ٹاؤن کا وزٹ کیا اور اس کا عنوان رکھا: Jihad Factory۔ اسی طرح یہ بات عام طور پر وہاں کے اخبارات میں لکھی جاتی ہے اور میڈیا میں آتی ہے کہ یہاں کے جو مدارس ہیں، ان میں دہشت گردی کو ہوا دی جا رہی ہے۔ مدارس میں جو معصوم طلبہ ہیں، ان کے ذہنوں میں نفرت بھری جا رہی ہے۔ جہاد اور قتال کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ خود کش حملوں کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور یہاں تک کہ شیعوں کو قتل کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ اس لیے ان مدارس سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ یہاں سے جو پڑھ کر نکلے گا، وہ وحشی ہوگا، درندہ ہوگا، خونخوار ہوگا۔ گویا یہ تاثر قائم کیا گیا ہے کہ یہ مدارس ملٹری کیمپ اور جہاد کی فیکٹریاں بن چکے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مذہبی حلقے نے اور ہمارے علماء کرام نے ان تعصّبات کو مضبوط کرنے کے لیے کیا رول ادا کیا ہے۔ ایک صاحب ہمارے حلقے میں ایک جانے پہچانے عالم دین ہیں۔ میں ان کا نام نہیں لوں گا۔ وہ خود کو طالبان کا باوا آدم اور طالبان کی تاریخ کا موجد کہتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ طالبان کے امیر ملا عمر ان کے مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں، حالانکہ ملا عمر نے ان کے مدرسے میں قدم تک نہیں رکھا۔ جب کبھی کوئی میڈیا کا آدمی اور صحافی ان کے مدرسے میں ملنے آتا تھا تو وہ بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ ملا عمر نے ہمارے ہی مدرسہ سے ڈگری حاصل کی ہے اور طالبان رہنماؤں میں فلاں وزیر، فلاں وزیر، فلاں وزیر ہمارے مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ معلوم نہیں ان کا مقصد کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ بات ہے کہ ان کے ہاں جو امریکی صحافی آتا ہے، وہ ان سے جو کچھ سننا چاہتا ہے تو وہی بات وہ ان کو سنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکیوں کے سامنے یہ بات کرنے

سے کہ میں طلبہ کو یہاں جہاد کی تعلیم دے رہا ہوں اور یہ بڑے ہو کر امریکہ کے خلاف جہاد کریں گے اور فلسطین کو فتح کریں گے اور یہی میرے بچے کشمیر پر جا کر حملہ کریں گے، ان کے خیال میں شاید اس سے امریکیوں کی نظر میں ان کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے اپنی قدر و قیمت بڑھانے کا۔ ان کا طریقہ واردات یہی ہے۔ جب بھی کوئی امریکی صحافی ان کے پاس آتا ہے تو نہایت مبالغہ کے ساتھ بڑھا چڑھا کر باتیں کرتے ہیں۔

اسی سلسلے میں، میں ایک اور بات بھی کہوں گا۔ لال مسجد کے المیہ سے پہلے ہونے والے واقعات نے بھی ہے مدارس اور علما کے بارے میں ایک منفی تاثر اور تعصب قائم کرنے میں بہت کردار ادا کیا ہے۔ ۲۰۰۷ء کے شروع میں جب یہ مسئلہ شروع ہوا تو میں اس وقت امریکہ میں تھا اور وہاں ان کے اخبارات کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ مدرسہ حفصہ کی طالبات کی طرف سے سب سے پہلے ایک پبلک لائبریری پر قبضہ کیا گیا۔ اس کے بعد پولیس کے ساتھ ان کی جھڑپیں ہوئیں اور ایک یا دو پولیس والوں کو وہ پکڑ کر لے گئے اور ایک دو دن تک انہیں محبوس رکھا۔ اس کے بعد ایک خاتون کو اغوا کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ بدکاری کو فروغ دے رہی تھی۔ اس کے بعد ڈی وی ڈی کی دوکانوں پر حملہ کیا گیا اور ان میں سے ایک دو کو جلا دیا گیا۔ ان کو دھمکیاں دی گئیں اور ہراساں کرنا شروع کر دیا گیا۔ اور سب سے آخر میں چینیوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ غازی عبد الرشید مرحوم اور غازی عبد العزیز کے دھواں دار بیانات اور جمعہ کے خطبے ہوتے رہے اور وہ روزانہ پریس کانفرنسز کر رہے تھے کہ ہم یہ کر دیں گے، ہم وہ کر دیں گے۔ اگر شرعی نظام نافذ نہ کیا گیا تو ہم ریاست کے خلاف بغاوت کریں گے۔ پھر کہا گیا کہ اگر شریعت نافذ نہ کی گئی تو ہماری بچیاں شہادت کے لیے تیار ہیں۔ پھر اس کے ساتھ آپ کیا دیکھتے تھے کہ بڑی بچیاں اسلام آباد میں انٹرنیشنل میڈیا کے سامنے، سی این این کے کیمروں کے سامنے کھڑی ہیں، سر سے پاؤں تک سیاہ برقعوں میں ملبوس اور ہاتھوں پر دستانے ہیں۔ اور کیا دیکھتے ہیں کہ ہاتھ میں آٹھ دس فٹ کی لاٹھی۔ آپ نے تصویریں دیکھی ہوں گی۔

نیو یارک ٹائمز میں، میں نے پہلی تصویر دیکھی جو اس کے فرنٹ پیج پر شائع ہوئی۔ اتنی بڑی تصویر تھی، آپ یقین جانیے کہ وہ تصویر اتنی خطرناک نظر آ رہی تھی کہ چہرہ بالکل بند ہے، تھوڑی سی آنکھیں نظر آ رہی ہیں، پورا جسم سیاہ کپڑے میں ملبوس ہے، ہاتھوں پر دستانے اور ہاتھوں میں بارہ فٹ کی لاٹھی اٹھائی ہوئی ہے۔ نیو یارک ٹائمز میں تصویر کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ اگر ہمارے مطالبات نہ مانے گئے تو ہم اس حکومت کے خلاف بغاوت کریں گی۔ ہم سڑکوں پر لڑیں گی، ہم پولیس سے لڑیں گی۔ جب یہ تصاویر شائع ہوئیں تو اس وقت امریکہ کی رائے عامہ پر کا اس کا کیا اثر ہوا، آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔ جو باہر رہتا ہے، اس کو اندازہ ہے۔ ایک متعلمہ لال مسجد کی چھت پر کھڑی ہے، ایک دروازے پر ہے اور کچھ مین گیٹ کے سامنے تین قطاروں میں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر ان کے ذہن میں ایک مسلمان خاتون کا تاثر قائم نہیں ہوا بلکہ ہٹلر کے گسٹاپو کا تاثر قائم ہوا۔ اس کے بعد اگر ہم شکایت کریں کہ مغرب ہمارے بارے میں غلط تاثر رکھتا ہے تو شاید ہم حق بجانب نہیں ہوں گے۔ ہماری بہنیں لاٹھیاں لہراتے ہوئے اسٹیٹ کو چیلنج کر رہی تھیں اور میڈیا کو بتا رہی تھیں کہ ہم اپنے مطالبات منوانے کے لیے حکومت سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہیں اور شہادت کے لیے تیار

ہیں۔ بعد میں جولائی میں لال مسجد کا واقعہ ہوا۔ صدر مشرف نے نہایت بے حیائی اور بے غیرتی کے ساتھ جس طرح بچیوں کو بھون ڈالا، وہ الگ داستان ہے، لیکن مغربی میڈیا میں مدارس کے بارے میں پہلے سے موجود تعصّبات میں لال مسجد کے واقعہ نے جو کردار ادا کیا ہے، اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور بات یہ ہے کہ مغرب کے میڈیا اور اخبارات میں مدارس کی تعداد کے بارے میں خاصی مبالغہ آمیز باتیں شائع ہوتی ہیں۔ میں نے مختلف اخبارات میں چھ، سات اور آٹھ لاکھ مدارس کی رپورٹیں پڑھی ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ میں جسے ایک پاکستانی رپورٹر نے تیار کیا ہے، مدارس کی تعداد ایک لاکھ بتائی گئی ہے۔ اسی طرح طلبہ کی تعداد تیس لاکھ، چالیس لاکھ اور آخری رپورٹ کے مطابق پچاس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ یہ سب ہوائی باتیں ہیں۔ کسی نے مدرسہ کا سروے نہیں کیا، نہ ہی کوئی مدارس سے پوچھنے کے لیے گیا ہے اور نہ ہی ان کو کسی ادارے وفاق المدارس یا تنظیم المدارس نے بتایا ہے۔

آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں۔ ایک چھوٹے سائز کا اخبار کرسچن سائنس مانیٹر آتا ہے جو میرے نزدیک صحیح خبریں شائع کرتا ہے۔ آج سے چار پانچ سال پہلے ایک خبر اس کے صفحہ اول پر شائع ہوئی اور اس کی ہیڈ لائن گوجرخان سے متعلق تھی۔ میں پڑھ کر چونک اٹھا کہ شاید پہلی دفعہ کسی امریکی اخبار میں میرے شہر گوجرخان کی ہیڈ لائن لگی ہے۔ اس کی سرخی یہ تھی کہ صدر مشرف کی کوششوں کے باوجود پاکستان میں مدارس کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ خبر گوجرخان کی تھی اور ان کے راولپنڈی کے نمائندے نے دی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ اس نے سروے کیا ہے جس کے مطابق گوجرخان میں پچاس مدرسے ہیں۔ گوجرخان میرا شہر ہے اور میں سال میں کم از کم دو مرتبہ اپنے شہر ضرور آتا ہوں۔ میں شہر کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس محلے میں ہم رہتے ہیں، اس کے بارے میں لکھا تھا کہ چھ مدرسے تو اس محلے میں ہیں۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا کہ کون سے چھ مدرسے اس محلے میں ہیں۔ میں اسی وقت اپنے لیپ ٹاپ پر بیٹھا اور اس کے ایڈیٹر کو ای میل بھیجا۔ میں نے کہا کہ آپ نے جس محلے میں چھ مدرسے بتائے ہیں، میرا اسی محلے سے تعلق ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پورے شہر گوجرخان میں آٹھ یا دس مدارس سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان آٹھ میں بھی میں جن کو صحیح طور پر مدرسہ کہوں، ان کی تعداد چار ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مبالغہ ہے، لہٰذا آپ دوبارہ اپنے نمائندہ سے تصدیق کر لیں۔ اگر میں پاکستان کے جنگ یا ڈان کو ای میل کرتا تو وہ میرا ای میل ردی کی ٹھوکری میں پھینک دیتے۔ لیکن امریکہ کے اخبار کرسچن سائنس مانیٹر کی بڑائی ہے کہ اگلے دن اس کے ایڈیٹر کا مجھے ای میل آتا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے ہمیں توجہ دلائی کہ اس خبر میں بہت مبالغہ آرائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں موجود نہ تھا۔ ہمارے جو اسلام آباد میں نمائندے ہیں، انھوں نے ہمیں رپورٹ بھیجی تھی۔ لیکن اب جب آپ نے اس پر اعتراض اٹھایا ہے تو ہم نے اسلام آباد کے ایک دوسرے صحافی کو ۵۰۰ ڈالر دیے ہیں اور اس کو کہا ہے کہ وہ گوجرخان جائے اور اس صحافی کو ساتھ لے جائے جس نے پچاس مدارس کی رپورٹ دی ہے اور جا کر دیکھے کہ وہ پچاس مدرسے کہاں ہیں۔ اس کے چار یا پانچ دن کے بعد مجھے ایڈیٹر کا ای میل آیا اور اس نے کہا کہ آپ کی بات کسی حد

تک صحیح تھی۔ جس صحافی کو ہم verify کرنے کے لیے بھیجا تھا، اس نے انیس مدرسے بتائے ہیں۔ میں نے جواب میں اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد لکھا کہ یہ انیس کی تعداد بھی مبالغہ پر مبنی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ باہر کی دنیا میں جن لوگوں نے مدارس پر کام کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار یا ایک لاکھ مدرسے ہیں تو وہ پاکستان کی ہر مسجد کو مدرسہ شمار کرتے ہیں۔ چونکہ پاکستان میں خطیب صاحب یا امام صاحب صبح بچوں کو تھوڑا سا قرآن پڑھا دیتے ہیں تو وہ باہر لکھ دیتے ہیں ''مسجد امیر حمزہ'' اور اس کے نیچے لکھ دیتے ہیں ''مدرسہ تجوید القرآن''۔ تو وہ لوگ اس کو بھی مدرسہ شمار کر لیتے ہیں۔ یہ ایک Trick ہے جس کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ساری رپورٹس میرے نزدیک صریح جھوٹ پر مبنی ہیں اور اسلام آباد میں بیٹھ کر کی جانے والی اس رپورٹنگ کو انٹرنیشنل میڈیا تحقیق کے بغیر من وعن قبول کر لیتا ہے۔ مثلاً ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس وقت پاکستان میں دس سے پندرہ فی صد لوگ مدرسہ میں پڑھ رہے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کس طرح مبالغہ آمیزی کی جاتی ہے۔

آخر میں ایک اور چیز کا میں ضرور ذکر کرنا چاہوں گا۔ چار سال پہلے جب مدارس کے بارے میں بہت شور وغل مچا کہ مدارس کس چڑیا کا نام ہے، یہ مدارس والے کیا کر رہے ہیں اور کیا پڑھا رہے ہیں تو ورلڈ بینک والوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کو مدارس کے نظام کے بارے میں ایک لیکچر دوں۔ خیر میں نے لیکچر دیا تو اس کے بعد تین چار سوال آئے۔ ان میں ایک سوال یہ تھا کہ مدرسہ کی فنڈنگ کہاں سے ہوتی ہے، پیسہ کہاں سے آتا ہے اور کون دیتا ہے۔ اگر آپ انٹرنیشنل رپورٹس پڑھیں تو یہی تاثر ملتا ہے کہ سارے مدرسے سعودی فنڈز سے چل رہے ہیں۔ سعودی فنڈز کے بغیر کوئی مدرسہ چل نہیں سکتا۔ میں نے انہیں کہا کہ بات یہ ہے کہ سعودی فنڈنگ کے بارے میں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ۱۹۷۹ء کے بعد عراق اور سعودی عرب کے درمیان شیعہ سنی محاذ آرائی شروع ہوئی تو اس وقت کچھ سنیوں کو، کچھ اہل حدیث کو سعودیوں نے پیسہ دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی تو مدرسے چل رہے تھے۔ ان کو فنڈز کہاں سے ملتا تھا؟ دوسری بات یہ ہے کہ سعودی عرب نے اگر پیسہ دیا ہے تو وہ اپنے ہم عقیدہ مدارس کو دیا ہے۔ خاص طور پر اہل حدیث کو خوب پیسہ دیا ہے۔ میں نے کہا کہ جو دیہات میں چھوٹے چھوٹے مدرسے ہیں، ان کو کون فنڈ دے رہا ہے؟ ان کو تو کمیونٹی فنڈنگ دے رہی ہے۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں پشاور گیا تو وہاں جی ٹی روڈ پر ایک مدرسہ تھا جس میں چالیس کے لگ بھگ طلبہ تھے اور ان میں دس پندرہ کے قریب کتابیں پڑھنے والے تھے، باقی چھوٹے طلبہ تھے۔ میں نے اس مدرسہ کے مولانا صاحب سے پوچھا کہ آپ کے مدرسہ کا ذریعہ آمدن کیا ہے؟ انہوں نے پہلے تو ہچکچاہٹ ظاہر کی۔ پھر وہ مجھے مدرسہ کے احاطے سے باہر لے گئے اور سامنے جی ٹی روڈ پر دو دوکانیں دکھائیں جو جنرل اسٹور کی طرح تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ان دوکانوں کا مالک بہت نیک اور اچھا آدمی ہے۔ وہ ایک دوکان کی آمدن اپنے پورے خاندان پر صرف کرتا ہے اور دوسری دوکان کی پوری آمدن مدرسہ کو دے دیتا ہے جس سے ہمیں کسی اور سے مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بنگلہ دیش میں، میں نے ایک مدرسہ کی چھپی ہوئی رپورٹ دیکھی جس میں عطیات کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ انڈے چار عدد،

دو مرغیاں، فلاں نے اتنے کلو چاول دیے، فلاں نے اتنی چیز دی۔ ان سب چیزوں کا حساب کتاب لکھا ہوا تھا۔ یہ وہ واقعات ہیں جو امریکیوں کو معلوم نہیں۔

دوسرا سوال جو ورلڈ بینک کی تقریر کے دوران مجھ سے لوگوں نے پوچھا، وہ مدرسے کے نظام تعلیم سے متعلق تھا۔ کیا وجہ ہے کہ مدرسے سے جو لوگ نکلتے ہیں، بہت بد ذہن ہوتے ہیں، ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ دنیا کے حالات کیا ہیں، معیشت کیسے چل سکتی ہے، معاشرت کیسے چلتی ہے، سیاسی نظام کیسے چل سکتا ہے وغیرہ۔ وہ اپنی زندگی میں مست ہیں، ہر جگہ اپنے مذہبی ذہن کو لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں اس کا جواب دینے والا ہی تھا کہ سامعین میں سے چھ آفیسرز کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ ایک کا تعلق مالی سے تھا، دوسرے کا تعلق ملایکانیا سے تھا، تیسرا نائیجیریا سے تھا، چوتھا تنے کاؤں سے تھا، پانچواں گمبیا سے تھا اور ایک شاید کسی اور ملک سے تھا۔ ان سب نے کہا کہ ہم مدرسوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہماری ابتدائی اور ہائی اسکول تک کی تعلیم مکمل دینی تعلیم ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہم کالجوں میں گئے ہیں۔ ان میں سے چار آدمیوں کے پاس اکنامکس میں امریکی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ہے اور دو نے کہا کہ ہم نے انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی ہے اور وہ اس وقت ورلڈ بینک کے بڑے ماہرین معاشیات میں سے تھے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ نے جو سوال کیا تھا، اس کا جواب تو آپ کو مل گیا ہے۔ گویا مدرسہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، پوری دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ جدید تعلیم میں بھی اتنی ہی کامیابی حاصل کریں جتنی انہوں نے دینی تعلیم میں کی۔

میں بنگلہ دیش کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز سے ملا ہوں۔ ان میں بیشتر مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں۔ سید سجاد حسین شاہ، ڈاکٹر سید علی اشرف، ڈاکٹر سید علی احسن، یہ سب مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ڈھاکہ یونیورسٹی اور بنگلہ دیش کی دیگر یونیورسٹیوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جو ٹاپ کے پروفیسر ہیں، وہ سب مدرسہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ مدرسے میں پڑھنے کے بعد ان کا ذہنی افق صرف مدرسہ ومسجد کی امامت وخطابت اور مدرسہ کی استادی تک محدود نہیں رہا، بلکہ وہ معاشرہ میں ہر سطح پر کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہاں پاکستان میں بعض مدارس کے بارے میں مجھے بتایا جاتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم دسویں جماعت کی تعلیم کی تیاری کرتا ہوا نظر آتا ہے تو اسے مدرسہ سے فارغ کر دیا جاتا ہے کہ یہ دین کو چھوڑ کر دنیا کی طرف جانا چاہتا ہے۔ غالباً آپ کا خیال یہ ہے کہ وہ آپ کے شکنجے سے نکل گیا ہے اور اس نے دینی تعلیم کو چھوڑ دیا ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ اگر آپ لوگوں نے اسے دینی تعلیم دی ہے تو وہ اس تعلیم کی شمع ہر جگہ روشن کرے گا، خواہ وہ کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہو، خواہ کسی اسکول میں اور خواہ وہ پولیس میں پہرے دار کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ کے مدرسہ کا پڑھا ہوا ہر فرد امامت خطابت ہی کرے تو یہ مناسب نہیں ہے۔

میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ۔

ڈاکٹر افتخار اقبال

ڈاکٹر ممتاز احمد صاحب میرے استاد ہیں اور مجھے مدرسہ اور اس کے نصاب ونظام سے انھوں نے ہی متعارف کرایا ہے۔ انہوں نے جو گفتگو کی ہے، وہ بہت جامع ہے اور اس کے بعد میں زیادہ بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

پاکستان کے مدارس کے مسائل کا اور خاص طور پر جو مغرب میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس کا انہوں نے ذکر کیا۔ کم بیش یہی صورت حال بنگلہ دیش کے مدارس کے بارے میں بھی پائی جاتی ہے۔

میری معلومات کے مطابق پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے مدارس میں طلبہ کی مجموعی تعداد ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان میں ساٹھ فی صد طلبہ بنگلہ دیش میں جبکہ باقی چالیس فی صد پاکستان اور بھارت میں ہیں۔ بنگلہ دیش میں مدارس کے طلبہ کی تعداد ۳۵ لاکھ ہے۔ اس کی وجہ عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے کہ بنگلہ دیش ایک غریب ملک ہے اور آبادی زیادہ ہے اور وہاں کے لوگ عصری تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا زیادہ تر لوگ اپنے بچوں کو مدارس میں بھیج دیتے ہیں۔ یہ وجہ کسی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن بالکلیہ درست نہیں ہے کیونکہ متوسط طبقات بھی اور اعلیٰ طبقات بھی اپنے بچوں کو مدارس میں بھیجتے ہیں۔ غربت کے علاوہ بھی کئی اسباب ہیں جن کے تحت لوگوں کا رجحان مدارس کی طرف زیادہ ہے۔ مدارس کا نظام بہت مقبول ہے اور لوگ اسے بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ عصری تعلیم کے مدارس اور کالجز میں ملک کی سیاسی کشمکش کا بھی کافی اثر ہے۔ طلبہ میں مختلف سیاسی تنظیمیں ہیں اور آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے عصری تعلیمی اداروں کا ماحول اور فضا تعلیم کے لیے اچھا نہیں ہے۔ پھر وہاں کا ماحول سیکولر ہے جبکہ بنگلہ دیش کے عوام کا عمومی مزاج مذہبی نوعیت کا ہے، اس لیے لوگ پسند نہیں کرتے کہ اپنے بچوں کو عصری اداروں میں بھیجیں۔ پھر یہ کہ بنگلہ دیش کی جتنی آبادی ہے، سرکاری نظام تعلیم اس کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ چنانچہ مدارس نے اس خلا کو پر کیا ہے اور وہ وہاں کے لوگوں کی خدمت کرتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کی ان کے ساتھ زیادہ وابستگی ہے اور انہیں کہیں باہر سے فنڈنگ کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

نائن الیون سے پہلے عرب ممالک سے مدارس کو فنڈنگ ملتی تھی جو نائن الیون کے بعد کم وبیش بند ہو چکی ہے، لیکن مدارس کے نظام میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ ان کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ ہم نے مدارس کے ذرائع آمدن پر باقاعدہ سروے کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نظام مکمل طور پر وہاں کی مقامی آبادی کی معاونت پر مبنی ہے۔ سروے میں مقامی لوگوں کے تعاون کی ۲۳ مختلف صورتیں آئیں۔ مثلاً زکوٰۃ وصدقات اور گھر میں جو کچھ کھانا پکایا گیا ہو، اس کا ایک حصہ مدارس کو بھیج وغیرہ۔ اس طرح کی ۲۳ کے قریب مختلف صورتوں میں مدارس کو معاونت ملتی رہتی ہیں۔ چونکہ یہاں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے، اسلام کے ساتھ وابستگی قائم رہتی ہے، ان کی اصلاح ہوتی ہے، اس لیے مدارس کے اس کردار کی وجہ سے مقامی آبادی ان کے ساتھ بہت زیادہ جڑی ہوئی ہے اور ان کی خدمت کو اپنا کام سمجھتی ہے۔